(Online) ISSN 2709-7633 (Print) |ISSN 2709-7641
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Psychological Analysis of "Tree" in Majeed Amjad's Poetry

مجید امجد کی شاعری میں شجر کا نفسیاتی تجزیہ

Humaira
Assistant Professor Department of Urdu Islamia Collage Peshawar at - Zari39@yahoo.com
Safdar Ali Shah
Assistant Professor in Urdu at Govt College Ghazi District Haripor KPK
atsafdarashah7@gmail.com
Afshan Jabeen
Lecturer Department of Urdu Malakand University at Afshanjabeen644@gmail.com

Abstract

As far as the modern Urdu poetry is concerned, Majeed Amjad is widely regarded as a multi-faceted, universal and leading poet. In this article, an attempt has been made to examine and x-ray the psychological and cultural dimensions of his characters inspired by and taken from nature. Majeed Amjad has created a magnificent pageant of characters using the phenomena of nature as his ultimate inspiration and muse. And thereby he has interpreted the obvious and hidden aspects of life in such a manner that makes us realize that nature is and inexhaustible and incredible treasure trove of sympathy, love, freedom, struggle for survival and knowledge and wisdom. Majeed Amjad, as if to very profound psychological evolution, is completely lost in his characters. His poetry affords us an everlasting and ever-relevant lesson that we can be eternally in touch with the Higher Reality only by living in the very heart of nature and by living in perfect harmony with nature.

مجید امجد کے اجتماعی لاشعور میں شجر اس قدر جاگزیں ہیں کہ جب بھی اس کی تنہائی میں دکھ نے شدت اختیار کی ہے تو مجید امجد نے اس کے ساتھ دکھ بانٹے ہیں۔ ''سوکھا تنہا پتا'' جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس میں وہ بیری کے پتے میں ڈھل کر خواب فنا کی تعبیر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ جبلت مرگ اس کے تصور محبت میں بس کر موت کوباعثِ مسرت بنا رہی ہے جبکہ نظم ''گاڑی میں'' ۱۲-۴-۱۹۴۳ میں مجید امجد ایک ایسے جنگل کے درختوں کو دیکھ کر اپنے اجتماعی لاشعور سے خودکلامی کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جنگل کے درخت فطرت کی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہاں پر انسانی حرص تہذیب کے (freewill) کامل آزادی کا اظہار ہیں۔ وہاں زندگی کی آج بھی منفی اثرات اور انسانوں کی طبقاتی تقسیم تک نہیں پہنچ سکی۔

جوں ہی انسان کے قدم وہاں پہ پہنچیں گے فطرت کے اندر بھگاڑ شروع ہو جائے گا۔ اور حقیقی آزادی مفقود ہو جائے گی۔ یہ ان کا ماضی کی طرف آزادی کے لیے لوٹ جانے کا ذہنی رجحان ہے۔ اس طرح مجید امجد نے رومانی شاعروں کی طرح ایسی جنت تخلیق کی ہے جس میں انسان معصومیت اور آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ بقول رشید الزمان:

ان چھوٹے بڑے جذباتی صدمات کے بعد مراجعت کے ایک مستقل ذہنی رویہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور مراجعت کا یہ رجحان شاعر کے کلام میں ایک خفی لہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ معاشرے اور تہذیب سے نامطمئن ہونے کے بعد انسان کے ماضی کی اداسی خام ہو جاتی ہے۔''(۱)

نظم ''دور کے پیڑ'' کو غور سے دیکھیں تو یہ جنگل کے درخت آزادی کی بجائے کوئی ہم نشین دلفریب دکھائی دیتے ہیں جن سے ملنے کو مجید امجد کب سے بے تاب ہے۔ لیکن وہاں جا کر کچھ اور صورتحال ہوتی ہے جو اس کے لیے باعث تشویش ہے۔

اشعار ملاحظہ ہوں:

کر رہے ہیں روز و شب اک عمر سے

میری شرمیلی تمناؤں سے چھیڑ

دور، جھلکتے آسمان کی اوٹ میں

ٹیکری پر لہلہانے والے پیڑ

آج آخر میں نے دل میں ٹھان لی

آج جا پہنچا میں، جا پہنچا وہاں

خستہ دل پیڑوں کی اک سونی قطار

خشک شاخیں، کھڑ، کھڑاتی ٹہنیاں

بے کفن لاشوں کی طرح آویختہ

اپنی جھولی میں لیے پہنائے دشت

برگ و بر کی لاکھ پشتوں کے مزار

ان میں جھونکوں کی صدائے بازگشت

جس طرح مردے کریں سرگوشیاں

دیکھتا ہوں اور یقیں آتا نہیں

آج ان ویرانیوں کا میرے نام

(2) کوئی پیغام حسین آتا نہیں

کرب ،اضطراب اور ویرانی نے مجید امجد کی زندگی کے اندر معانی کی نئی دنیا کی طرف راستے کھولے۔پیڑوں کے اوپر گزرنے والی خزاں ہو یا شہروں کی توسیع ہو،اشجار کی زندگی کو بقا کے شدید خطرات لاحق ہیں۔فطرت کو نقصان پہچانا بھی گویا انسانیت کو ہی نقصان پہچانے کا دوسرا نام ہے۔ اپنی شاعری میں زندگی کی فطرت کے ذریعے تفہیم کرتے وقت مجید امجد نے بہت سے انسانی رویوں کے پیچھے محرکات کو بے نقاب کیا ہے۔بقول ڈاکٹر افتخار بیگ:

وہ سماج کے جامد و ساکت رویوں، گلتی سڑتی روایات اور منافقانہ طرز عمل سے عاجز محسوس ہوتا ہے اور زندگی کے مسائل کو اپنے عرفان اور اپنی آگہی کے حوالے سے دیکھنا چاہتا ہے۔''(3)

ماضی قدیم سے لے کر اکیسویں صدی تک درخت انسانی زندگی کا ہاتھ پکڑ کر اسے جہنم میں گرنے سے بچا رہا ہے۔ نظم ''ایک کوہستانی سفر کے دوران میں'' (۴-۱۲-۱۹۴۸) میں یہ شجر کے کردار نے ثابت کیا ہے کہ انسانی

زندگی کا اصل مقصد دوسروں کی دستگیری ہے۔ دوسروں کو مشکلات میں گرنے سے بچانا ہے۔ تب ہی انسان کو روحانی بلندی نصیب ہوتی ہے مگر افسوس آج کے دور میں انسان ایک درخت کی بوسیدہ ٹہنی سے بھی کم تر مخلوق بن گیا ہے جو راہگیروں کو کھڈ میں گرنے سے بچاتی ہے۔

یہاں درخت بدھ مت کے مذہبی تصورکی طرح کسی نورانی وجود کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک بوسیدہ ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ

!سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں

!آہ ان گردن فرازنِ جہاں کی زندگی

(4) اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

یوں مجید امجد فطرت کی تہذیب کے اندر ایک ایسی پراسرار قوت کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو انسانی زندگی کی نہ صرف مدد گار ہے بلکہ اسے سکون اور عرفان بھی فراہم کرتی ہے۔ بقول سید عامر سہیل:

مجید امجد کے یہاں ''شجر'' کا ایک حوالہ بے نیازی، گیان دھیان اور ذات کے اندر ڈوب کر شناخت کر لینے کا بھی '' ہے۔ ویسے بھی ہندوستانی تہذیب اور تاریخ میں درخت اور اس کی چھاؤں عرفان و آگہی، تپسیا اور نروان حاصل کرنے کی جگہ ہے۔''(5)

شجر کی فلاح کا یہ حوالہ مجید امجد کی نظم ''ہری بھری فصلو'' (۱۹۵۳ء) میں بیک وقت تین جہتوں سے سامنے آتا ہے۔ معاشی طور پر زندگی کو فعال بنانے اور عام سطح پر ایک تہذیبی ورثے کو دوسرے تہذیبی ورثے میں تبدیل کرنے اور افزائش نسل کے حوالے سے یہاں بھی مجید امجد کی نظم کے آخری بند میں یہ ہری بھری فصلیں صدیوں کے تسلسل سے انسانی تہذیب کے آگن میں پکتی چلی آئیں ہیں۔

انسان جنگل کے دور سے لے کرآج تک ہمارے میدانوں میں کسانوں کے خون پیسنے سے فصلوں کا سونا تیار ہو کر شہروں میں بسنے والی آبادی کی ہر جھولی میں رزق بن کر جاتا چلا آیا ہے۔ اور انہی فصلوں کے اناج سے حضرت آدمؑ نے نسل کا سلسلہ رواں رکھا ہے۔ اسی لیے تو مجید امجد پنجاب کے کھلے میدانوں میں کاشت کی گئی فصلوں کو دعا دیتے ہیں کیونکہ ان کا کردار انسانی تہذیب کی بقا میں ریڑھ کی ہڈی کا ہے۔

اشعار ملاحظہ ہوں:

قرنوں کے بجھتے انگار، اک موج ہوا کا دم

صدیوں کے ماتھے کا پسینہ، پتیوں پر شبنم

دور زماں کے لاکھوں موڑ، اک شاخِ حسیں کا خم

زندگیوں کے تپتے جزیروں پر رکھ رکھ کے قدم

ہم تک پہنچی عظمت، طنطنہ آدم

!جھومتے کھیتو! ہستی کی تقدیرو! رقص کرو

!دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو

!چندن روپ سجو

ہری بھری فصلو!

جگ جگ جیو پھلو! (6)

یوں مجید امجد نے شجر کو بطور کردار پیش کرتے ہوئے نہ صرف پاکستان کے پہاڑی علاقوں کی جیتی جاگتی زندگی پیش کی ہے بلکہ میدانی علاقوں میں سر سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں پر زندگی پر زندگی کا انحصار دکھاتے ہوئے ایسے مناظر کی فلسفیانہ تفہیم کچھ اس طرح سے کی ہے کہ فطرت اور انسان کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو پھر سے استوار ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ''ہری بھری فصلو'' اس سلسلے کی بہترین مثال ہے کہ زندگی تو آگے بڑھنے کے سفر کا نام ہے اور فصلیں انسانی تسلسل کو آگے ہی بڑھاتی ہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

''زمین پر روئیدگی ثبوت حیات ہے اور مجید امجد اس نظم میں جب ہری بھری فصلوں کو دعا دیتا ہے تو وہ حیات اور قوتِ حیات کو دعا دے رہا ہوتا ہے۔ (اور یاد رکھیے کہ مایوس انسان اتنی مثبت دعا دینے کا اہل ہی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے نزدیک اس کا کوئی جواز ہی نہیں ہوتا۔''(7)

مجید امجد کی شجر کے ساتھ محبت اور گہرا تعلق اپنے اردگرد کے ماحول میں شجر کے تحفظ کی آواز بن کر ابھرا ہے۔ اکیسویں صدی میں بڑھتے ہوئے صنعتی نظام میں ہر چیز خام مال کے طور پر وافر مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ انسان نے فطرت کے اس عظیم محافظ شجر کی وسیع پیمانے پر خرید و فرخت کر دی۔ فطرت کے نظام میں اک المیے نے سر اٹھانا شروع کیا جو کہ مجید امجد کی نظم ''توسیع شہر'' (۹۔۲۔۱۹۶۰) میں شجر کے کردار کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ یہاں اشجار مکمل جیتی جاگتی شخصیت کے طور پہ ابھرا ہے۔ اس کا سایہ اس کی سانسوں کا طلسم اور بانکپن بیس ہزار کے عوض موت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ جب اس کے زندہ جسم پر آرے چلائے گئے اور دھڑا دھڑ اس کی زندگی کی فلک پوش دیوار لاشوں کے ڈھیر کی صورت میں گرنے لگی۔ تو یہ قتل عام دیکھ کر دھوپ بھی سہم گئی۔ زندگی کے اس کل میں مجید امجد بھی وہیں ایک شجر کی طرح کھڑا ہے۔ اس کی ذات ایک شجر کی لہکتی ڈال کی طرح ہے۔ وہ محسوس کر رہا ہے کہ زر کی تہذیب کے آرے اس کے جسم کو بھی کاٹ رہے ہیں۔ اس مقام پر وہ پوری انسانیت کو شجر کے ساتھ مشخص کر کے پکارتا ہے کہ اب اس کی ذات پر بھی ایک مرتبہ کاری ضرب لگائے تاکہ وہ آہستہ آہستہ کٹنے کے عمل سے دو چار نہ ہو۔

شجر ایک ایسے بے بس انسان کے روپ میں پیش ہوا ہے جس کی زندگی کا سودا کر دیا گیا ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بے وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تاکہ زر کی تہذیب کے شہر کی توسیع ہو سکے۔ مجید امجد اپنے معروض کے شعوری ذکر سے جب الم ناک انجام پہ پہنچتا ہے تو لاشعور میں اتر کر محسوس کرتا ہے کہ درختوں کے ساتھ ہی جمالی اقدار اور روحانی زندگی کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے۔بقول گلزار وفا:

'' اس مقتل کے گردن زنوں سے احتجاجاً کہتا ہے کہ تمہارے مقتل میں میری روح کے سوا کچھ زندہ باقی نہیں بچا ..... تم جو تمام نوجوان نسل کو روحانی موت کے اندھیروں میں دھکیل چکے ہو۔ میری زندہ اور تابندہ سوچ کو بھی زندگی کے نور سے محروم کیوں نہیں کر دیتے۔''(8)

توسیع شہر'' میں جس کرب ناک حقیقت کو معاشرے کے بے رحم رویے کی بدولت ابھرتا ہوا دکھایا گیا ہے '' اس کا واشگاف اعلان نظم ''جلسہ'' (۲۷۔۷۔۱۹۷۰) میں درخت کے کردار جو کہ مشینی انسان کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ کر رہے ہیں۔ یہاں یہ بھی کٹے ہوئے ان شیشم کے درختوں کا غم و غصہ انسانوں کے خلاف ہے۔ جنھوں نے معاشرے کے منافق، استحصالی اور جابرانہ رویوں کے ذریعے فطرت اور فطرت جیسے معصوم انسانوں کو کاٹ کر معاشرے سے الگ کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے صنعتی عزائم کو تکمیل کا جامہ پہنا سکیں۔ وہ ایسے انسانوں میں زندہ رہنے کے بجائے مادے استبداد قائم ہو (Nature) کی بجائے زمین کی پاتال میں گر جانے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ جہاں نیچر جائے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں،

اور یہ پانی تمہاری باری کا تھا،

اب کے بادل دریاؤں پر جا کر برسے

ان سے تمہارا بھی تو عہد نامہ تھا

اب کیا ہو گا ؟ .....

چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسموں، پاتالوں میں گڑجاؤ

ورنہ''

اس تیکھی حجت میں اتنی سچائی تھی

جٹے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصے میں .....

اور میری آنکھوں میں پھر گئے دکھ اک ایسے خیال کے، جس کی ثقافت

جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈھ رہی ہے! (9)

اور دولت کا بادل مجبور و بے بس پیڑوں کے بجائے دریا پر برس جائے۔ ان ہی مجبور پیڑوں نے تو کل استحصال کا شکار ہونا ہے۔ یہ پیڑ نچلے طبقے کی علامت بن گئے ہیں۔ جن پر ظلم و جبر فرعون کے دور میں بھی ہوتا تھا اور اب بھی ویسے ہی رواں ہے۔

سایہ دار درختوں کے اس طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی کردار کے بعد نظم ''صاحب کا فروٹ فارم'' (۱۹۶۲۔۳۔۸) میں مجید امجد نے پھلدار درختوں کے نظام زیست میں کردار کو اجاگر کیا ہے۔ یہاں ان سنگتروں کے درخت کے کردار کی زبانی بتاتے ہیں کہ کوئی بھی چیز تنہا ایک افادی پہلو میں نہیں ڈھلتی۔ ان درختوں کی آبیاری میں دھوپ کے مہین آنچل کا مس ہونا، زمین کی زرخیز چاندی کو پانی میں لے کر ہر ایک سنگترے تک پہچانا، پھر اس سنگترے کا دھوپ میں تپ کر سونے میں ڈھل جانا ایک ایسا خارجی عمل ہے جو نہ صرف فروٹ فارم کے مالک کے لیے کثیر رقم کا ذریعہ ہے بلکہ ان درختوں کی زندگی کا نچوڑ، ان کا رس بک کر کتنے ہی افراد کو فرحت و اطمینان دے گا لیکن ان درختوں کی یہ قربانی اور ایثار ان کو کیا دے گی۔ زندگی کا محنت کش طبقہ کے ساتھ یہی عمل ہوتا ہے۔ وہ وقت کی پینگ کو آگے بڑھانے کے لیے غموں اور دکھوں کا زہر پیتے رہتے ہیں اور بالکل ان سنگترے کے پودے کی طرح ان کی شاخوں پر لگے پھل امیر طبقے اتار کر لے جاتا ہے۔ ان کی زندگیوں کو نچوڑ کر باقی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ وقت کی بے رحم پینگ جھولتی رہتی ہے۔ زندگی کے ایک طرف مثبت پہلو تو دوسری طرف منفی پہلو رواں رہتا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ منفی پہلو کیوں زندگی کی مثبت اقدار پہ حاوی ہو چکا ہے۔ اور سرمائے کے بل پر مثبت کو نچوڑ کر منفی زندگی کے ارضی میدان میں فروغ پا رہا ہے۔

یہ کچھ ایسا نظام جبر ہے جس میں معاشرے کا پھلدار طبقہ وہ لوگ ہیں جو دکھوں کا رس نکال رہے ہیں۔ دکھ ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔ جو ان لوگوں کو فعال رکھتے ہیں۔ اور اسی فعالیت سے زندگی کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس رس اس طبقے کے ہاتھ آتا ہے جو کہ طفیلیہ بن چکا ہے۔ اس طرح ایک سنگترے کا درخت اکیسویں صدی کی زندگی کی تفہیم کی علامت بن چکا ہے کہ باغ میں پکنے والے مالٹے اس باغ کے غریب رکھوالوں اور اس کا مقدر (Elite class) کے قریب غریب بستی کو نصیب نہیں ہوتے بلکہ ڈبوں میں پیک ہو کر اسلام آباد میں بسنے والوں بن جاتی ہے۔ بقول قاسم یعقوب:

''اس نظم کے ساختیاتی مطالعے سے مجید امجد کے فلسفہ حیات کو ان کے لاشعور میں سمجھنے کی مدد ملی ہے۔ دکھوں کا رس، وہ مرکزی خیال ہے جس کے اردگرد نظم کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ یہی وہ رس ہے جس سے حیات کی چھاگل بھری ہوئی ہے۔ ہم اپنی محنتوں سے اس رس کشید کرتے ہیں۔ فروٹ فارم کے پھل نیچرل عمل کے ذریعے اپنا رس تیار کرتے ہیں۔ انسان کی محنت کے ردعمل میں دکھ کا رس پیدا ہوتا ہے۔ مجید امجد نے اس جبر کو حیات کا لازمی جز سمجھا ہے۔ ان کی کئی نظموں میں اس جبر کو زندگی کی اٹل حقیقت بتایا گیا ہے۔''(10)

یوں شجر کا کردار مجید امجد کے ہاں دوست، دستگیر، ساتھی، بھکاری، عارف و عرفان، محنت کش طبقے کی نمائندگی کے علاوہ جیون ساتھی اور محبوبہ کے کردار میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً نظم ''سنگت'' (۱۹۶۰ء)، ''گھور گھٹاؤں'' (۱۹۔۹۔۱۹۶۹) اور ''سر سبز پیڑوں کے سائے'' (۶۔۵۔۱۹۶۵) کے اشعار دیکھیے:

.....پیڑوں کی لچکیلی بانہیں ..... کونپلو کے کنگن پہنے

.....(11) جھک جھک کر ..... جھیل کے پانی پر سے چننے آئی ہیں

نظم ''سنگت'' میں شیشم کی شاخ پر چنبلی کے پھولوں بھری بیل دیکھ کر مجید امجد کے ذہن میں محبت کی یادیں لوٹ آئیں ہیں۔ اولاد اور اس سے خالی زندگی کا دکھ اس چنبیلی کی بیل اور اس کے پھولوں کو زبانی بیان کیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جیون کی پرچھائیں میرے من میں تیر گئیں

اچھے اچھے پھولوں کے لچھے پھولوں کے

(12) لچھے پھولوں کے

ان کی نظم ''یہ سر سبز پیڑوں کے سائے'' (۶۔۵۔۱۹۶۵) درخت اور اس کا سایۂ مجید امجد کے لیے محبوبہ کی یاد کا حوالہ رکھتا ہے جبکہ بھی کسی سر سبز درخت کے سائے سے گزرا اس کو شالاط یاد آئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

ایک اور نظم ہے ..... یہ سر سبز پیڑوں کے سائے۔ گو اس نظم میں بظاہر عورت یا محبوبہ کا ذکر نہیں لیکن مجید '' امجد نے بالواسطہ طور سے درخت کے ذکر سے ''سانس کی ریشمیں رو'' تک رسائی حاصل کی ہے۔''(13)

مجید امجد نے زندگی اس راز کو پا لیا ہے کہ فطرت اور فطرت میں موجود ہر چیز ایک دوسرے کی زندگی کو چلانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ ایک ارضی حقیقت ہے کہ درخت انسانوں اور جانوروں کے لیے آکسیجن اور خوراک فراہم کرتا ہے۔ یہ موسموں کے تغیر و تبدل اور زمین کے کٹاؤ کی روک تھام کے لیے ضروری ہے۔ زمین میں جب درخت کو انسان نے حد سے زیادہ شکار کیا تو اس کے نقصانات تمام عالم فطرت بھگت (Eco-system) کے اس رہا ہے۔

مجید امجد نے زندگی کے اس کل میں درخت سے واسطہ سائنسی اور خارجی حقائق کے علاوہ درخت کی روحانی و تہذیبی شناخت کو متعین کیا ہے۔ انھوں نے درختوں کے تحفظ کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے سے گریز نہ کرنے کا سبق دیا ہے۔

مجید امجد کی نظم میں پرندوں کی کرداری پیشکش

اصناف کا تحفظ ممکن ہے۔ جب تک درخت ہیں (Species) درخت کی زندگی کے ساتھ جانوروں کی بہت سی ان کے ساتھ پرندوں کی رہائش اور زندگی کی بقا کا تسلسل قائم ہے۔ انسان نے درختوں کے ساتھ رہنا چھوڑ کر پختہ مکانوں اور ان کی تنظیم، کیمونٹی کی صورت میں معاشرے نے جنم لیا، معاشرے نے ترقی کر کے شہروں کو جنم دیا اور شہروں نے ذرائع رسل و رسائل اور صنعتی ترقی سے علوم و فنون کو آگے بڑھایا۔ حتیٰ کہ فطرت پر انسان کی حکومت و استبداد قائم ہو چکا ہے۔ مختلف معاشروں، ثقافتوں، تہذیبوں اور تمدنوں میں فطرت کے اندر ایسے عمرانی فلسفے کو جنم دیا ہے جو فطرت کے اندر زندگی کے جدید و عمرانی نظاموں پر مشتمل ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید عشرت:

''ایک انفرادیت کی بناء پر سرمایہ داریت اور دوسرے اجتماعیت کی بناء پر اشتمالیت کے سماج کی شکل میں دونوں نظاموں اور نظریات کا مطمع نظر صداقت کی یافت اور انسانی مسرت کے حصول کو انسان کے لیے ارزاں کرنا ہے اور دونوں مدعی ہیں کہ وہ انسانی فطرت کی اساس پر اپنی اٹھان رکھتے ہیں۔''(14)

حوالہ جات

1 رشید الزمان، مجید امجد..... ایک تاثر، مشمولہ: القلم، ص:۴۶۹

2 ایضاً، دور ے پیڑ، ص:۸۴۔۸۵

3 افتخار بیگ، ڈاکٹر، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، ص:۱۴۸

4 ایضاً، ایک کوہستانی سفر کے دوران میں، ص:۱۰۲

5 سید عامر سہیل، ڈاکٹر، مجید امجد، نقش گر ناتمام، ص:۳۲۷

6 ایضاً، ہری بھری فصلو!، ص:۱۴۸۔۱۴۹

7 احمد ندیم قاسمی، اک پیراہن خاشاک میں لپٹا ہوا، مشمولہ: مجید امجد ایک منفرد آواز، ص:۱۰۹۔۱۱۰

8 گلزار وفا، کہانی، مشمولہ: قند، مجید امجد نمبر، ص:۱۲۸

9 کلیات مجید امجد، جلسہ، ص:۵۷۴۔۵۷۵

10 قاسم یعقوب، صاحب کا فروٹ فارم، نظم کا ساختیاتی مطالعہ، مشمولہ: مجید امجد ایک منفرد آواز، ص:۲۹۶

11 ایضاً، گھور گھٹاؤں، ص:۵۳۲

12 ایضاً، سنگت، ص:۳۶۲

13 وزیر آغا، ڈاکٹر، مجید امجد کی داستانِ محبت، ص:۴۰۔۴۱

14 وحید عشرت، ڈاکٹر، فلسفہ عمرانیات، ص:۱۰۷